مرزبوم

ناول

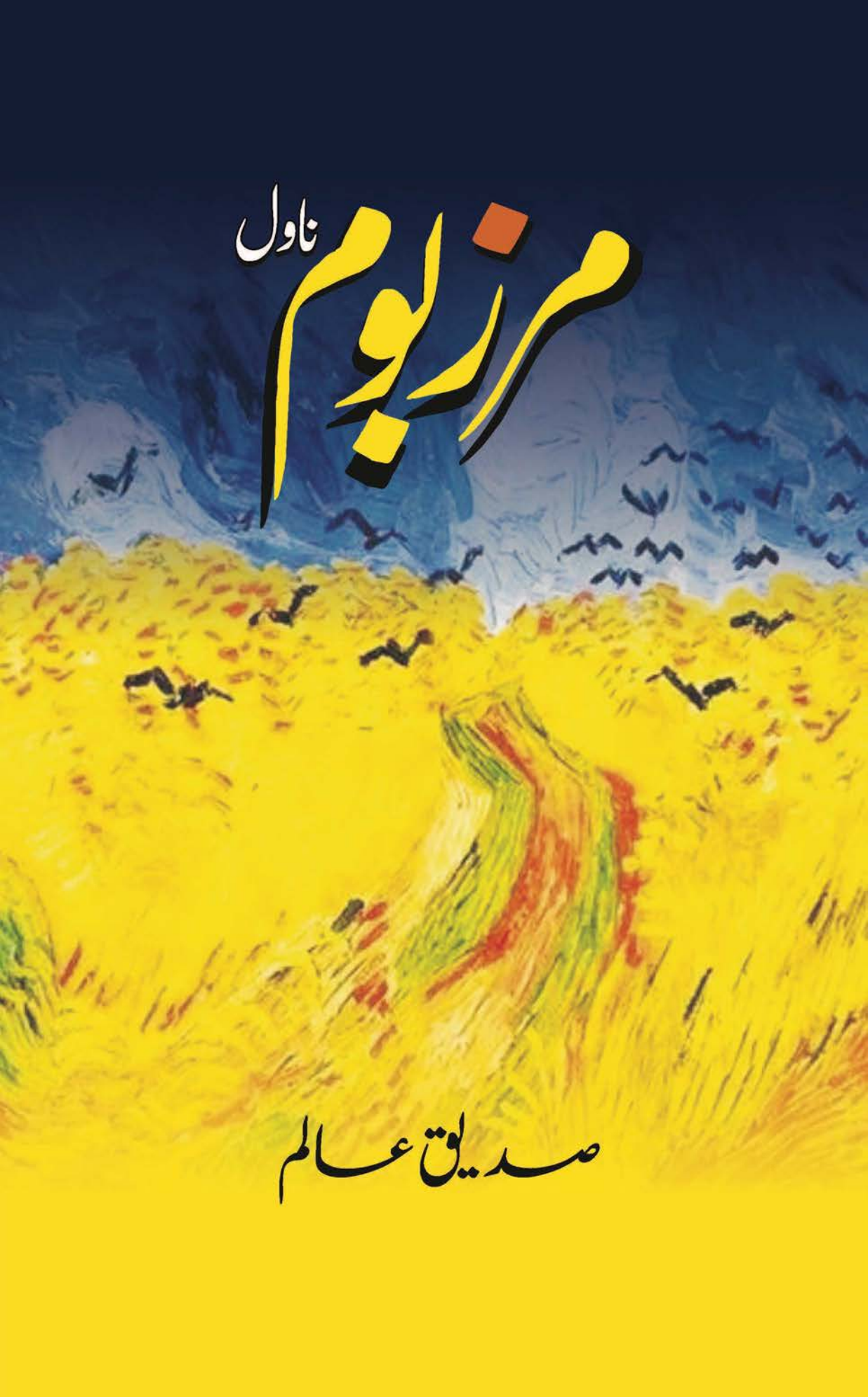

صدیق عالم

- 1 -

ریلوے اسٹیشن

میں ابھی ابھی ٹرین سے اترا ہوں ۔ پلیٹ فارم میرے کمپارٹمنٹ کی سیڑھی سے بھی چھ انچ نیچے ہے۔ بھیڑ سے الگ ہو کر میں اپنا اٹاچی کیس اسفلٹ کے فرش پر کھڑا کر دیتا ہوں اور انگڑائی لیتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھتا ہوں جہاں چیلیں اڑ رہی ہیں۔ دھواں اور گھٹن سے بھری ایک لمبی رات کے بعد جب کمپارٹمنٹ کی کھڑکیوں سے ہوا طوفان کی طرح لگا تار ٹکراتی رہی تھی اور لوہے کے چھوٹے بڑے پلوں سے گزرتے وقت پہیوں کی گڑگڑاہٹ مسافروں کی نیند خراب کر رہی تھی، سر پر پھیلا ہوا آسمان، اسٹیشن کا سناٹا اور کھلا پن اچھا لگ رہا ہے۔ فضا میں صبح کی خنکی ہے جو تر کی حمام کی طرح اُبلتے اس شہر سے ایک بالکل الگ طرح کا احساس ہے جہاں سے میں آرہا ہوں ۔ پیکٹ میں بچا ہوا آخری سگرٹ نکالتے ہوئے میں دیکھتا ہوں مسافروں کو پلیٹ فارم پر اترنے میں اچھی خاصی پریشانی ہو رہی ہے۔ خاص طور پر عورتوں اور بوڑھوں کو ہاتھوں سے سہارا دینا پڑ رہا ہے۔ زیادہ تر کھڑکیوں پر پانی کے نشان ہیں۔ کسی کسی پر قے کی لکیر بھی ہے۔ اونچے درجوں کی دائمی طور پر بند کھڑکیوں کے شیشے اندر کی کاربن کے سبب کچھ زیادہ کالے ہو گئے ہیں۔ دوسرے کمپارٹمنٹس کے دروازے اور کھڑکیاں پوری طرح کھول دیے جانے کے سبب اندر کی بساند باہر پھیلنے لگی ہے جس میں لیویٹری سے گرتے گندے پانی کی مہک شامل ہے۔ ٹرین پلیٹ فارم پر ہو یا سگنل پر رکی ہوئی ہو ٹوئلٹ استعمال کرنے کی سخت ممانعت ہے، مگر لوگ انھیں استعمال کرنے سے باز نہیں آتے ۔ زیادہ تر مسافروں کی آنکھوں سے رات کی

کسلمندی اتر نہیں پائی ہے۔ وہ لگیج اٹھائے آلسی پیروں کو گھسیٹتے ہوئے، بے ترتیب بالوں اور اترے ہوئے چہروں کے ساتھ داخلے کی طرف بڑھ رہے ہیں یا بچوں کو گود میں اٹھائے یا کھینچتے ہوئے قلیوں کے ساتھ قدم ملانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کچھ مسافروں کا رخ اوور برِج کی طرف بھی ہے۔ یہ وہ پسنجر ہیں جنھیں یا تو ٹرین بدلنی ہے یا اسٹیشن کے عقب میں اتر کر دریا کے کنارے کنارے شہر کی مضافات میں جانا ہے یا فیری گھاٹ میں اتر کر ناؤ پکڑنی ہے۔

ان مسافروں میں، میں بھی ہوں۔

میں جو اکیس برس بعد اپنی مرزبوم واپس لوٹ رہا ہوں۔

}{

مرزبوم!

اگر میری یادداشت ٹھیک ہے تو میں جہاں پیدا ہوا وہ ایک قصبے سے کچھ زیادہ نہ تھا جو دریا کے کنارے بسا ہوا تھا۔ مگر میرا لڑکپن آتے آتے وہ علاقہ ریلوے کی آمدورفت کے نظام میں کافی اہم ہو اٹھا۔ دراصل اس روٹ پر ٹرین چلائے جانے پر ملک کے کئی بڑے شہروں کے درمیان کے فاصلے کو بہت حد تک کم کیا جا سکتا تھا۔ ظاہر ہے، ٹرینوں کے گزرنے کے لیے نہ صرف دریا پر ایک محرابوں والا پل بن گیا بلکہ ریلوے منسٹر کا تعلق چونکہ ہمارے ہی علاقے سے تھا، ڈِوژنل منیجر کا دفتر جو ڈیڑھ سو میل دور ایک دوسرے شہر میں واقع تھا، کافی سیاسی ہنگامہ اور ہُو ہلڑ کے باوجود ہمارے علاقے میں منتقل کر دیا گیا۔ لیکن اس تبدیلی کے پیچھے اکیلا ریلوے کا ہی ہاتھ نہیں تھا۔ اس سے پہلے ہی دریا پار اسٹیل کے ایک بڑے کارخانے کی بنیاد پڑ چکی تھی جس کے سبب دریا کے دونوں کناروں پر بہت سارے چھوٹے بڑے معاون اور ذیلی کارخانے ککرمتوں کی طرح اُگ آئے تھے بلکہ ایک تھرمل پاور پلانٹ بھی بن گیا جو ہمارے شہر سے چھ کوس دور دریا کے کنارے اپنی چمنیوں اور بلاسٹ فرنس کے ساتھ کسی کارخانے کی طرح نظر آتا۔ یہاں اس سیمنٹ کے کارخانے کا ذکر فضول ہے جو اسٹیشن کے قریب واقع ہے جہاں پر میں ابھی ابھی اترا ہوں۔ ان تمام چیزوں کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ میرے قصبے نے دیکھتے دیکھتے ایک شہر کی صورت اختیار کر لی۔

آج جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے میری مرزبوم ایک شہر سے بھی آگے نکل چکی

ہے بلکہ ایک ایسے شہر میں ڈھل چکی ہے جس سے ملک کی بہت ساری اہم ٹرینیں گزرتی ہیں بلکہ آئے دن اسٹیشن کے پبلک اڈریس سسٹم پر نئی ٹرینوں کا اعلان ہوتا رہتا ہے۔ظاہر ہے یہ شہر اب وہ نہیں رہا جسے میں ہائر سکنڈری کے امتحان کے بعد چھوڑ کر گیا تھا جہاں چھوٹی موٹی تبدیلیوں کے باوجود چیزیں بہت دور جانہ پائی تھیں۔ جہاں تک ان خبروں کا تعلق ہے جو رشتے داروں کے ذریعے اڑتی پڑتی میٹرو پولس میں واقع ہمارے گھر تک پہنچ جایا کرتی ہیں اس شہر کی اب نہ صرف پوری طرح کایا پلٹ ہو چکی ہے بلکہ اس کی گھڑیاں بھی تیز چلنے لگی ہیں، اتنی تیز کہ وہاں ہفتے کا ہر دن ایک جیسا نہیں ہوتا۔لیکن شاید یہ اس بات پر منحصر کرتا ہے کہ آپ کی سوچ کیا ہے، کہ آپ کس طرح کی زندگی گذارنا پسند کرتے ہیں کیونکہ ایک بتدریج پھیلتے ہوئے شہر کی اور تمام خرابیوں میں ایک یہ بھی ہے کہ چونکہ ساری دنیا کے لوگ روزی روٹی کی تلاش میں منھ اٹھائے اس طرف چل پڑتے ہیں، وہاں پر مقامی زندگی کے پیرا کھڑ چکے ہوتے ہیں۔ظاہر ہے ہر جگہ کی طرح یہ جگہ بھی اپنا رنگ بدلنے پر مجبور ہوگئی ہوگی۔آخر اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ بدلتے وقت کے مطابق اگر آپ نے خود کو نہیں ڈھالا تو مقامی ہونے کا کتنا بھی دعویٰ کریں، عین ممکن ہے کہ آپ خس وخاشاک کی طرح ایک کنارے کر دیے جائیں؟

}{

تو تقریباً دو دہائی کے بعد (اگر میں نے صحیح گنتی کی ہے) میں اپنی مرزبوم واپس لوٹ رہا ہوں جہاں جیسا کہ پرانے لوگ کہا کرتے تھے، میرا نال گڑا ہوا ہے، (بشرطیکہ آپ ان دو دنوں کو چھوڑ دیں جب دادی کے انتقال پر ہمیں گھر کے تمام افراد کے ساتھ بڑی جلد بازی میں کار پر لد کر آنا پڑا تھا، جسے آنا مشکل سے کہا جا سکتا ہے کیونکہ وہ دو دن لوگوں کی بھیڑ اور افراتفری کی اس طرح نذر ہو گئے تھے کہ ہمیں اپنا مرزبوم آنے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا)۔اس وقت جب کہ پلیٹ فارم پر دوسرے مسافروں کے ساتھ چلتے ہوئے میں ان دو دنوں کو یاد کر رہا ہوں جب ہم خود بھی اپنے پشتینی مکان میں مہمانوں کی طرح نظر آرہے تھے، تو میرا اٹاچی کیس میرے لمبے قد کی مناسبت سے قدرے چھوٹا نظر آرہا ہوگا۔ان دنوں کسی وجہ سے میں جب بھی سفر پر نکلتا ہوں، یہی اٹاچی کیس میرے ساتھ ہوتا ہے۔ایسا شاید اس لیے ہے کیونکہ اسے نہ صرف ڈھونے میں آسانی ہوتی ہے بلکہ اگر ترتیب سے رکھا جائے تو ایک مختصر سفر کے سارے ضروری لوازمات اس میں

آسانی سے سما جاتے ہیں، جیسے پتلون شرٹ، زیر جامے، تولیہ، شیونگ کِٹ، پرانے اخبار میں لپٹی ہوئی چپل (اور میں اس کا خاص خیال رکھتا ہوں کہ وہ اردو اخبار نہ ہو کیونکہ لوگوں کو اللہ اور رسول کے نام اردو اخباروں میں آسانی سے دکھائی دے جاتے ہیں)، سفر کے دوران وقت کاٹنے کے لیے ایک آدھ کتابیں یا رسالے اور کاربوزائم کی چھوٹی بوتل جو سفر کے دوران میرا ہاضمہ درست رکھتی ہے۔ اوور برج کی سیڑھی چڑھتے ہوئے میری نظر پٹریوں کے درمیان اُگی ہوئی گھاس اور خودرو پودوں کی طرف چلی جاتی ہے جو اس بات کی چغلی کھا رہے ہیں کہ اس اسٹیشن کی دیکھ ریکھ ٹھیک طرح سے نہیں کی جاتی ہوگی۔ کیا کسی وجہ سے اس کی اہمیت دن بدن کم ہوتی جا رہی ہے یا کسی جدید کاری کے پیش نظر، جسے شروع ہونے میں برسوں لگ جاتے ہیں، یہاں پر ہر طرح کی مرمت روک دی گئی ہے جیسا کہ ان حالات میں اکثر ہوتا ہے؟ میں آدھا اوور برج پار کر چکا ہوں جب میری ٹرین ایئر ہارن بجا کر ڈیزل کی مہک پھیلاتی ہوئی چل پڑتی ہے۔ میں اٹاچی کیس کو چوبی فرش پر اپنی ٹانگوں کے درمیان کھڑا کر دیتا ہوں اور ہوا کی طرف پشت پھیر کر سگرٹ سلگاتے ہوئے، جسے میں نے اب تک انگلیوں کے درمیان دبا کر رکھا ہوا تھا، دور دریا پر بنے ہوئے پُل کی طرف دیکھتا ہوں جس سے ہو کر ٹرینیں ہمارے شہر میں داخل ہوتی ہیں۔ پُل کافی فاصلے پر ہونے کی وجہ سے دھند میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس ایک نمبر کے پلیٹ فارم کو چھوڑ کر جہاں میں اترا تھا باقی کے پانچوں پلیٹ فارم پر فی الحال کوئی گاڑی نظر نہیں آتی، سوائے اس چھوٹی ٹرین کے جو اسٹیشن سے الگ تھلگ سرخ اینٹوں والے گداموں کے باہر سائڈنگ پر کھڑی ایک اوور ہیڈ ٹینک سے پانی لے رہی ہے۔

سلیپر، ریل، فش پلیٹ، کلِپ
پِسٹن، پِنین انجن، بوئلر، سلنڈر، سیفٹی والو
فائر بکس، سٹیم وِسل، ایش پین، واٹر ٹینک، بفر
لکڑی، کوئلہ، ڈیزل، بجلی، مقناطیس (ہورس پاور)،
مقن قنا ناط طی ییس س

بچپن میں جب یہاں پر اسٹیل اور سیمنٹ کا کارخانہ بنا نہ تھا اور میری مرزبوم ایک قصبہ

کی شکل میں ہوا کرتی تھی تو دنیا سے ہمارا واحد رابطہ یہی ریلوے اسٹیشن تھا جہاں مسافروں کی ریل پیل ہوا کرتی۔ ان دنوں بھی، جب اس کی اَپ اور ڈاؤن لائن پر صرف دو پلیٹ فارم ہوا کرتے تھے، آج کی طرح اسے جنکشن کہا جاتا تھا کیونکہ ان دو لائنوں کے علاوہ بھی جو دریا کے کنارے کنارے اسٹیل کے کارخانے کی طرف چلی گئی تھیں (جس کی چمنیاں اس کے اپنے انڈیلے گئے انگاروں کے پیچھے آج پوری طرح چھپ چکی ہیں) ایک چھوٹی لائن بھی تھی جو شاہی قلعہ کی اونٹ کٹاروں سے ڈھکی ہوئی خندق کے کنارے دور تک نظر آتی۔ اس پر ہر صبح سورج نکلنے کے کچھ گھنٹے بعد وہی چھوٹی ٹرین گھونگے کی رفتار سے رینگتی ہوئی خود اپنے غلیظ دھویں کے اندر غائب ہو جایا کرتی، مگر غروب آفتاب کے وقت سرخ آسمان کے نیچے کسی کھلونے کے مانند نمودار ہو جاتی صرف اس فرق کے ساتھ کہ اب اس کا دھواں قرمزی نظر آتا۔ اس ٹرین کا رخ ان دور افتادہ دیہاتوں کی طرف ہوا کرتا جہاں سے موسمی مزدور بڑی تعداد میں ہمارے علاقے کے کھیتوں یا اینٹ کے بھٹوں میں کام کرنے آتے یا گرمیوں میں تالاب اور کنوؤں کی کھدائی صفائی کرتے یا اپنے پیروں پر ٹاٹ باندھ کر کھولتی پچ سڑکوں پر پھیلایا کرتے۔ وہ چھوٹی لائن آج بھی اپنی پرانی حالت میں موجود ہے اور اس وقت اوور برج سے اس کے سیاہ رنگ کے سلنڈر نما انجن کو لوہے کی سرخ چمنی کے ساتھ دیکھنا کافی رومانٹک لگ رہا ہے۔ لیکن وہ دن دور نہیں جب یہ چھوٹی لائن بڑی لائن میں بدل دی جائے گی اور اس کا کوئلے کا انجن اسی اسٹیشن کے باہر چبوترے پر نمائش کے لیے لگا دیا جائے گا۔ میں اس ٹرین پر کئی بار چڑھ چکا ہوں اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں اس میں سفر آسان نہیں ہے۔ اول تو یہ بہت دھیمی رفتار سے چلتی ہے، اسے ان گنت لیول کراسنگ پار کرنا پڑتا ہے جہاں روٹ پر واحد ٹرین ہونے کی وجہ سے کسی گیٹ مین کی پوسٹنگ نہیں ہوتی اور ہر بار ٹرین کو روک کر فائرمین کو دونوں طرف کے گیٹ بند کرنے اور کھولنے پڑتے ہیں۔ دوسرے اس کی چمنی سے نکلتے دھوئیں کے بادلوں کے ساتھ کوئلے کے ذرات باہر آ کر مسافروں کے بال اور کپڑوں پر لگاتار گرتے رہتے ہیں بلکہ آنکھوں میں داخل ہو کر جھلیوں کو سرخ ہو جانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اس وقت جب کہ اس کا انجن اپنے کوئلے کے ٹنڈر کے ساتھ، جو اوپر تک کچے کوئلے سے بھرا ہوا ہے، کرین سے پانی لے رہا ہے میں ریلنگ پر ہاتھ رکھ کر سوچ رہا ہوں، کاش یہ میرے سامنے روانہ ہوتی اور میں خندق کے کنارے اس کی چمنی سے دھواں نکلتے دیکھ پاتا۔ بچپن کی یادیں معمولی

سے معمولی چیز پر بھی ایک چمکتا ہوا غلاف چڑھا دیتی ہیں۔ انجن کے فائر بکس کا ڈھکن کھلا ہوا ہے جس کے اندر دھدھکتی آگ میں فائر مین سر پر رومال باندھے بیلچے سے کوئلہ جھونک رہا ہے جب کہ ڈرائیور انجن کی کھڑکی پر کہنیاں ٹکائے سگرٹ پھونک رہا ہے۔ اس کے سر پر بھی ایک سفید رومال بندھا ہوا ہے۔ دونوں کی طرف تاکتے ہوئے یہ اندازا لگانا آسان ہے کہ جب ٹرین شام کو سرخ آسمان کے نیچے اپنے قرمزی دھویں کے ساتھ نمودار ہوگی تو دونوں کے سر پر بندھے رومال بالکل داغدار ہو چکے ہوں گے۔ ان مسافروں کی طرف نہ تاکتے ہوئے جو اس سے لاپروا کہ ٹرین ابھی چھوٹے سے کچے پلیٹ فارم پر مسافروں کے لیے لائی بھی نہیں گئی تھی، اپنے سوٹ کیس اور بقچوں کے ساتھ خالی ڈبوں کے اندر لکڑی کی بنچوں پر بیٹھ رہے تھے، ڈرائیور ہماری طرف تاک رہا تھا۔

میں اسٹیشن کے آخری پلیٹ فارم پر اتر آیا ہوں اور دھات کے ایک سڑے گلے جنگلے پر اپنا سایہ ڈالتے ہوئے چل رہا ہوں جو میرے ساتھ کچھ دور چل کر اچانک ٹیڑھا ہو کر ڈھال پر سیڑھی کی طرح لٹک گیا ہے۔ پرانے دنوں میں جب ہم شادی بیاہ کی غرض سے یا رشتے داری کی خاطر آس پاس کے شہروں میں جایا کرتے، ڈامر کے بنے یہ دونوں پلیٹ فارم اتنی خستہ حالت میں نہیں تھے بلکہ اسٹیشن کے سب سے اہم پلیٹ فارم ہوا کرتے تھے۔ اب ان دونوں کو دیکھ کر لگ رہا ہے، یہ بہت زیادہ استعمال میں نہیں آتے ہوں گے یا شاید ان کی پٹریاں مال گاڑیوں کے گزرنے یا نہ رکنے والی تیز رفتار پسنجر ٹرینوں کے لیے مخصوص ہو چکی ہیں کیونکہ اَپ لائن کا پلیٹ فارم بالکل ویران پڑا ہے جب کہ میرے پلیٹ فارم پر جس سے ڈاؤن لائن کی ٹرینیں گزرتی ہیں، بہت کم مسافر نظر آرہے ہیں اور یہ وہی مسافر ہیں جو میری طرح یا تو اوور برج سے نیچے اترے ہیں یا سیڑھی چڑھ کر دوسرے کسی پلیٹ فارم کی طرف جا رہے ہیں یا ان کا ارادہ اوور برج سے گزر کر اسٹیشن کے چوراہے پر اترنے کا ہے جہاں مسافروں کے لیے بس، ٹریکر اور آٹو رکشا کھڑے رہتے ہیں۔ پلیٹ فارم پر انگریزوں کے زمانے میں لگائے گئے لحیم شحیم درخت اپنے ٹوٹے پھوٹے بیضوی چبوتروں کے اندر کھڑے ہیں جن کے تنوں سے لے کر ٹین کے متروک سائبانوں تک خودرو بیلوں کا قبضہ ہے بلکہ زنگ خوردہ شیڈس سے یہی مردہ یا نیم مردہ بیلیں لٹک رہی ہیں جن کے نیچے سے گزرتے ہوئے ہمیں ایسا محسوس ہو رہا جیسے ہم کسی گھنے جنگل میں آ گئے ہوں۔

گرچہ میرا ٹکٹ میرے اپنے شہر تک کا تھا اور میں کوئی بھی لوکل ٹرین یا عام ٹرین پکڑ کر

دریا پار کرتا ہوا اپنے شہر کے اسٹیشن پر اتر سکتا تھا جو ہمارے گھر کے بالکل قریب واقع ہے یا میٹرو پولس سے کسی ایسی ٹرین میں سوار ہو سکتا تھا جو مجھے سیدھے میری مرزبوم پر اتار دیتی، تو سوال یہ اٹھ سکتا ہے کہ میں نے اس اسٹیشن میں اترنے کو کیوں ترجیح دی جہاں سے نہ صرف ناؤ پر بیٹھ کر آپ کو دریا پار کرنا پڑتا ہے بلکہ کھیتوں اور میدانوں میں ایک کوس کا فاصلہ الگ، تب جا کر کہیں آپ کو اپنا شہر دکھائی دیتا ہے؟ شاید اس کی میری کوئی نفسیاتی مجبوری رہی ہو۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ یہ ملک دھیرے دھیرے میرے ہاتھ سے نکلتا جا رہا ہے، اور اب میرے لیے وقت آ گیا ہے کہ اس کے اندر اپنی مرزبوم کو ڈھونڈ نکالوں اور کسی کیکڑے کی طرح اس کی ریت کے اندر غائب ہو جاؤں۔ شاید اسی چھان بین کے مقصد سے میں نے اس سفر کا جوکھم اٹھایا ہے۔ لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ معاملہ یہی ہے۔ جب آپ سفر پر نکلتے ہیں تو بہت ساری وجوہات ایسی ہوتی ہیں جن کا اندازہ آپ کو پہلے سے نہیں ہوتا۔